ڈاکٹر ضیاءالحسن
استاد شعبہ اردو،اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی،لاہور

فیض احمد فیضؔ کی شاعری اور ہمارا عہد

Dr. Zia ul Hassan

Depratment of Urdu, Punjab University, Lahore

The Poetry of Faiz Ahmad Faiz and Current Era

It has always been very difficult for a poet to transform his ideology into poetry. He shows this miracle with the force of metaphor. Faiz knew this fact, so he created metaphors .The force of this Metaphorical expression enabled his poetry to penetrate in the hearts of his readers and expanded its acceptance. In these days while the humanity is suffering from wilderness of the capitalists, the poetry of Faiz has become more valid.In this article the views and thoughts of Faiz are analyzed in the perspective of current Era.

فیضؔ صاحب کو ہم سے بچھڑے لگ بھگ ربع صدی گزر گئی لیکن ان کی شاعری کی کشش آج بھی دِلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔کسی شاعر کی عظمت اور اس کے تخلیقی کارناموں کی زندگی کا مدار اسی کشش پر قائم ہوتا ہے۔کسی شاعر کو نہ تو اس کی شخصیت اور نہ ہی نقاد زندہ رکھ سکتے ہیں۔تخلیقی زندگی کے دوام کی واحد ضمانت شاعر کا زندہ تخلیقی تجربہ ہے۔ایسے شاعر جو اپنی شاعری کی بنیاد کسی نظریے یا نظامِ فکر پر استوار کرتے ہیں،ان کے لیے نظریے کو تخلیقی تجربے میں ڈھالنا دیگر شاعروں کی نسبت زیادہ دشوار ہوتا ہے کیوں کہ تخلیقی تجربہ متخیّلہ کی سرزمین پر وقوع پذیر ہوتا ہے جہاں شعور کم متحرک ہوتا ہے اور لاشعوری محرکات زیادہ طاقت ور ہو جاتے ہیں جب کہ نظریے کو بیان کرنا بہ ظاہر شعوری عمل نظر آتا ہے۔اردو کے تینوں بڑے شاعروں نے اپنی شاعری کی فکری بنیاد نظریے پر رکھی ہے۔میر و غالب وحدت الوجودی فکر اور اقبال قرآنی نظریۂ حیات کو بنیاد بناتے ہیں۔تینوں کے ہاں ایک مربوط نظامِ فکر نظر آتا ہے۔ پہلے دو شاعروں نے اپنے تخلیقی تجربے کے لیے غزل کی صنف کا انتخاب کیا جو اپنی ریزہ خیالی کے حوالے سے معتوب ہے اور اسی لیے ان کی فکر مربوط ہونے کے باوجود مربوط نظر نہیں آتی۔نظریاتی شاعری کا پہلا

الزام اقبال کے سر لگا۔

نظریے کو شاعری بنانے کا واحد رستہ یہی ہے کہ نظریہ شاعر کی شخصیت میں اتنا رچ بس جائے کہ متخیّلہ کے عمل میں خود بہ خود شریک ہو جائے۔ بہ صورت دیگر نظریہ منظوم اظہار (Verification) بن کر بے رس ہو جاتا ہے۔ شاعری اور منظوم اظہار میں استعارہ فرق پیدا کرتا ہے۔ استعارہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں مستور تخلیقی آہنگ کو دریافت کرتا ہے۔ دریافت کا یہی عمل شاعر کو ناشاعر سے ممتاز کرتا ہے۔ ابتدائی ترقی پسندوں نے براہِ راست بیان پر زور دیا۔ ابتدائی جوشیلے ترقی پسند نقادوں کے مضامین شاعری کے ہدایت نامے ہیں جن میں شاعروں سے معاشی، سیاسی اور سماجی استحصال اور طبقاتی تفریق کے خلاف شاعری کرنے کی ترغیب اور کہیں کہیں احکامات دیے گئے ہیں۔ شاعروں کو ترقی پسند تحریک کے منشور کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترقی پسند شاعروں پر اس تنقید کے گہرے اثرات مرتب ہوئے لیکن فیض صاحب نے اس تنقید کی روشنی میں شاعری کرنے کے بجائے تخلیقی تجربے کی بازیافت کو فوقیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں استعارہ سازی کا عمل فراواں ہے جسے ان کے عہد کے سکہ بند ترقی پسند نقادوں نے ناپسند کیا اور اعتراضات کے انبار لگا دیے۔ فیض کی شاعری کے خلاف لکھنے والوں میں ہیئت پسند اور جدیدیت پسند نقادوں کے ساتھ خود ترقی پسند نقادوں کا ایک حلقہ بھی متحرک رہا ہے جنھوں نے فیض کے دل ربا اسلوب شعر کو غیر ترقی پسندانہ قرار دے کر رد کر دیا لیکن فیض نے شاعری کے سلسلے میں دونوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور تخلیقی تجربے کی بازیافت میں منہمک رہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> واقعہ یہ ہے کہ اگر انھوں نے اپنی زندگی میں جنوں کا فرمان واپس نہیں پھیرا تو شاعری میں فن کے تقاضوں اور جمالیاتی قدروں سے کبھی روگردانی نہیں کی۔۔۔۔ فیض کی شاعری کی اس منفرد معنویت کی وجہ سے بعض ترقی پسند نقادوں کو ان سے یہ شکایت رہی کہ ان کے اسلوب و انداز میں جمال کی بہتات ہے اور جلال کا فقدان ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فیض کی ضمن میں جمال و جلال کی بحث لاحاصل ہے۔ ان کے تخلیقی عمل کی بھٹی میں سے مسِ خام بھی کندن بن کر نکلتا ہے۔ (۱)

فیض صاحب کا یہی عمل ان کے شعری تجربے کے دوام کا باعث ہے۔ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں سب سے زیادہ زیر بحث رہنے والا شاعر فیض ہے۔ بہ ظاہر اقبال کی شاعری پر لکھا جانے والا انبار فیض سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے لیکن اس انبار کے جمع ہونے کے محرکات ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہیں اور اس کے پس منظر میں ریاست کے وسائل ـــــ انعامات، اعزازات، عہدے وغیرہ زیادہ کارفرما ہیں۔ کسی بھی سرکاری بزم فیض، فیض اکادمی، فیض ایوارڈ کے بغیر فیض کی شاعری کی تفہیم و تحسین کا کام مسلسل ہو رہا ہے اور فیض کے درمیان سے اٹھ جانے کے بعد اس کام کی رفتار میں اضافہ روز افزوں ہے۔ فیض کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری ہماری آج کی زندگی کے مسائل و معاملات، ہماری آرزوؤں اور تمناؤں سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

فیض صاحب نے شاعری کو پراپیگنڈا اور نعرہ نہیں بننے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ پراپیگنڈا اور نعرہ تو نظریے کی تخلیقی

قوت بھی ضبط کر لیتا ہے، شاعری تو نظریے سے زیادہ نازک مزاج ہوتی ہے۔ وہ تخلیقی عمل کے علاوہ کسی اور عمل کو قبول نہیں کرتی اور ہر بیرونی مطالبے کو رد کر دیتی ہے۔ فیض نے نظریے کی وضاحت اور اشاعت کے لیے نثری تحریر کو ذریعہ بنایا اور شاعری کے لیے نظریے کے تخلیقی عناصر کو منتخب کیا۔ مارکسی نظریہ سرمایہ داری نظام کے نتیجے میں بننے والے طبقاتی سماج میں پسنے والے انسانوں کے غالب اکثریتی گروہ کے باطنی مطالبات کی واحد امید ہے۔ فیض کی زندگی میں سرمایہ داری نظام اور اس کے زایدہ طبقاتی سماج کی بہیمیت، آج ربع صدی بعد کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ اس معاشی نظام کی تقویت اور پھیلاؤ کی خاطر دو عالمی جنگیں لڑی گئیں جن میں لکھوکھا انسان مارے گئے اور زخمی و معذور ہوئے۔ انسانوں کے کام آنے والے بے اندازہ وسائل ضائع ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں سرمایہ دار ملکوں نے امریکہ کی سربراہی میں جس تیسری عالمی جنگ کی منصوبہ بندی کی، اس میں اب تک ہونے والا جانی و مالی نقصان پہلی دونوں عظیم جنگوں سے بڑھ گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی جنگیں سرمایہ دار ممالک کے درمیان لڑی گئیں اور بتیس (۳۲) سال سے جاری تیسری غیر اعلانیہ عالمی جنگ کا میدان ایشیا کے پس ماندہ ممالک بنے۔ پہلی دونوں عالمی جنگیں چند سال کے اندر ختم ہوگئیں کیوں کہ اس کا نشانہ براہِ راست یورپ و امریکہ کا وحشت و بربریت سے لبریز نام نہاد مہذب انسان تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی ایٹمی تباہی کا نشانہ بننے والا ایک ایشیائی ملک تھا اور اب تو جنگ ایشیا کے بھی زیادہ پس ماندہ ملکوں میں لڑی جا رہی ہے اور اسی وجہ سے بتیس سال سے جاری ہے اور اسے روکنے کے لیے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس جنگ کے اصل معاشی و سیاسی مقاصد کیا ہیں لیکن یورپ و امریکہ کے آزاد باشندے بھی اسے روکنے سے قاصر ہیں۔

اس جنگ کو رکنا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ جن ممالک میں یہ جنگ لڑی جا رہی ہے، وہاں کے باشندے شیعہ سنی منافرت، اردو سندھی/ پنجابی بلوچی، پشتو منافرت، پختون ہزارا منافرت، مہاجر مقامی منافرت اور خدا جانے کس کس طرح کی منافرتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اسی لیے یہ کبھی ڈرون حملوں، کبھی خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ سے مرتے ہیں اور مرتے ہی چلے جاتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔ یہ قاتل، چور، بدمعاش، سمگلر، منشیات فروش اپنے حکمرانوں کے طور پر منتخب کرتے ہیں، بنیادی انسانی وسائل اور ضرورتوں سے محروم ہیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں۔ جان، مال، عزت سب کچھ گنوا دینے کے باوجود جانے کیا بچانے کی فکر میں بزدلی و بے غیرتی اوڑھ کر سوئے ہوئے، انھیں مرنا ہی چاہیے۔ یہ ہزاروں سال سے غلام ہیں اور اس وقت تک غلام رہیں گے جب تک اپنی حالت اور طاقت کا شعور حاصل نہیں کریں گے اور اپنے دشمن کو نہیں پہچانیں گے۔ فیض صاحب کی شاعری انسانوں کے ایسے گروہوں کو شعور عطا کرتی ہے۔ جو لوگ اس شاعری کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں، وہ خود کو پہچان سکتے ہیں اور دشمن کو بھی۔ انھیں ایک راہ مل جاتی ہے اور ایک منزل نظر آ جاتی ہے۔ فیض صاحب کی شاعری کے مستقبل کو دو حوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے، ایک فکری اور دوسرا اسلوبی۔ فیض کی شاعری جس فکر سے فیض حاصل کرتی ہے، اس کی منزل اشتراکی سماج ہے۔ دنیا گزشتہ ایک صدی سے اس اشتراکی عالم گیر سماج کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام اس کی راہ میں مزاحمت اور رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو دنیا کے بیش تر وسائل پر تصرف

حاصل ہے۔ وہ پولیس، جاسوس ایجنسیوں، فوج اور اسلحے، ڈالر، پاؤنڈ اور یورو، سیاست، مذہب اور سائنس ہر ذریعے سے اس بابرکت دور کی راہ روکنے میں اپنی قوت صرف کر رہا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر یہ معاشی نظام زوال کی ڈھلوان پر آ نکلا ہے لیکن اتنے عظیم الجثہ وجود گرتے گرتے بھی بہت وقت لے لیتے ہیں۔ اس لیے فیض کی شاعری کی معنوی اہمیت صدیوں تک برقرار رہے گی۔ اگرچہ ایک عالمی اشتراکی نظام کی منزل یقیناً انسان حاصل کر کے رہے گا لیکن اس کے لیے بھی اسے نہ جانے کب تک آرزو، طلب اور تمنا کو اپنے دل میں پالنا ہوگا اور کام کرنا ہوگا۔ اس لیے فیض کی شاعری کی معنوی ضرورت آنے والی کئی صدیوں تک قائم رہے گی۔ اگر فیض کا اسلوب غیر تخلیقی اور نثری سطح کا ہوتا تو دیگر کئی ہم عصر ترقی پسند شاعروں کی طرح فیض کی شاعری بھی اب تک قصہ ماضی بن گئی ہوتی۔ شاعری کی تاثیر تحریکیں پیدا نہیں کرتیں، تحریکیں ذہن سازی کرتی ہیں لیکن شاعری میں اثر تخلیقی تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ جن تحریکی شاعروں نے شاعری کو پراپیگنڈا اور نعرہ سمجھا اور بنایا، آج زیرِ بحث نہیں۔ ہر مخالفت کے باوجود اگر فیض کی شاعری آج بھی موضوعِ گفتگو ہے تو اس کی وجہ اس کے وہ تخلیقی عناصر ہیں جو استعارہ پیدا کرتے ہیں۔ فوری نتائج کے خواہاں خام اذہان جس شاعری کا مطالبہ کر رہے تھے، فیض نے اسے رد کیا اور اپنے تخلیقی ہنر کو بروے کار لانے میں مسلسل کوشاں رہے۔ وہ استعارے کے جادو سے آگاہ تھے۔ یہ خیال کہ عام یا غیر تربیت یافتہ قاری استعارے کی تفہیم سے قاصر رہتا ہے، غلط ہے کیوں کہ مسلسل زیرِ بحث رہنے سے اعلیٰ شعری تجربے کی استعاراتی معنویتیں کُھلتی چلی جاتی ہیں اور ایک وقت کے بعد اس کی مطلوبہ معنوی جہات تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ ہر قسم کے قاری کے لیے قابلِ تفہیم ہو جاتی ہیں لیکن اس عمل میں کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ انقلاب بھی کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو فوری طور پر مکمل ہو جاتا ہے۔ انقلاب کے لیے راستہ ہموار کرنے والوں میں وہ دھیرج ناگزیر ہوتا ہے جو نتائج سے بے پروا ہو کر جدوجہد پر یقین سے پیدا ہوتا ہے:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

شاعری کی تاثیر کے بارے میں ایلیٹ نے لکھا تھا کہ اگر معاشرے میں شاعری کا ایک قاری بھی موجود ہو تو شعر کا اثر پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے۔ جس طرح جھیل میں کنکر پھینکیں تو اس کی لہریں کنارے تک جاتی ہیں، اگرچہ کنارے کے قریب ان کی طاقت کم ہو جاتی ہے، اسی طرح شعر کے ایک قاری کے اثرات پھیلتے پھیلتے پورے معاشرے تک پہنچتے ہیں، اگرچہ وہ آخر تک آتے آتے نہ اتنے براہِ راست ہوتے ہیں نہ طاقت ور لیکن اگر معاشرہ شعر پسند اور شعر فہم ہو تو شاعری معاشرے کی کایا کلپ کر سکتی ہے۔ یہ کایا کلپ نظریاتی کایا کلپ سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ نظریہ کے مخالف اذہان بھی پیدا ہوتے ہیں کیوں کہ نظریہ شعوری عمل ہے۔ شاعری تخلیقی عمل ہے اور اس کے اثرات بھی وجدانی اور تخلیقی سطح پر مرتب ہوتے ہیں، اس طرح کہ جس پر مرتب ہو رہے ہوتے ہیں وہ بھی بے خبر ہوتا ہے اور جب اسے خبر ہوتی ہے تو وہ اثرات اس کی شخصیت کا لازمی جزو بن چکے ہوتے ہیں جنھیں وہ چاہے بھی تو شعوری طور پر ختم نہیں کر سکتا۔ شاعری کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے قاری پر ایک احتیاط لازم ہے کہ وہ شعر سے لطف اندوز نہ ہو کیوں کہ لطف اندوز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری اس کے

باطن میں اتر گئی ہے۔اس کے بعد اس کے لیے شاعری کے اثرات سے بچنا ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ اس کی روح کا مطالبہ ہو جاتے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اسی لیے میں شاعری کے تخلیقی لطف کو شاعری کا پہلا اور اصل معنی قرار دیتا ہوں کہ وہ لفظوں میں مستور معنوی و استعاراتی مفہوم سے زیادہ طاقت ور اور مؤثر ہوتا ہے۔یہ لطفِ شعر جس بنیادی عنصر سے پیدا ہوتا ہے وہ استعارہ ہے اور اس سے تناسب، توازن اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں جو انسانی باطن کے لیے سب سے زیادہ پرکشش ہوتے ہیں۔اس لیے شاعرانہ فکر اگر استعارے میں ملفوف نہ ہو تو محض نظریہ ہے اور اگر استعارے میں لپٹی ہوئی ہو تو شاعری ہے جس کا اثر شعور اور لاشعور دونوں پر ہوتا ہے۔فیض شعر کی اس طاقت سے آگاہ تھے، اس لیے انھوں نے اپنے دیگر ترقی پسند ہم عصروں کے برعکس نظریے کو شعر بنانے پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھی اور اسی وجہ سے ان کی شاعری آج بھی اپنے پورے تخلیقی اور فکری طمطراق کے ساتھ ہمیں اپنا خوگر اور اسیر کر لیتی ہے۔

فیض صاحب کی شاعری کی ہمارے عہد کے ساتھ ایک اور Relevance بھی ہے۔آج دنیا مجموعی طور پر جس بے بسی اور ناامیدی کا شکار ہے، اردو بولنے والی دنیا میں یہ نامرادی و ناامیدی بیسیوں گنا زیادہ ہے کہ یہ دنیا معاشی و سیاسی اعتبار سے بہت پس ماندہ ہے جس کی طرف میں نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے۔اس مایوس انسانی باطن کا پہلا تقاضا امید ہے۔فیض کی شاعری انسان کے روشن مستقبل کی امید پیدا کرتی ہے۔فیض کی شاعری کا یہ رجائی پہلو احمقوں کی جنت میں رہنے والوں جیسا نہیں ہے بل کہ انسانی تاریخ کے گہرے تجزیے سے پیدا ہوا ہے۔اگر ہم انسان کی ہزاروں سالہ جدوجہد کو سمجھیں تو آسانی سے اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ اپنی تمام کم زوری اور بے بضاعتی کے باوجود انسانی باطن میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جو چاہتا ہے، ہو جاتا ہے اور جسے وہ ناپسند کرتا ہے، نابود ہو جاتا ہے۔انسان نے اڑنا چاہا تو اس نے اڑن قالین، اڑن کھٹولہ مصنوعی پر، اڑنے والے غبارے بناتے ہوئے ہوائی جہاز، راکٹ اور خلائی اسٹیشن تیار کیے۔اسے غلامی ناپسند تھی تو غلاموں کے حقوق کی جدوجہد سے ظاہری و جسمانی غلامی کے خاتمے تک پہنچا اور یقیناً باطنی و تخلیقی آزادی کی منزل تک بھی پہنچے گا۔اسے بادشاہت ناپسند تھی تو آج وہ جمہوریت کی منزل تک پہنچا ہے، یقیناً وہ آزاد اشتراکی سماج کی منزل بھی حاصل کر کے رہے گا۔عورتیں جانور اور اس سے بھی کم تر شے کی حیثیت رکھتی تھیں، مسلسل جدوجہد سے انھوں نے کافی حد تک انسانی مرتبہ حاصل کر لیا ہے، یقیناً وہ مرد کے مساوی انسانی مقام تک بھی پہنچیں گی۔یہ انسانی روح کے مطالبات ہیں جنھیں طاقت سے معطل تو کیا جا سکتا ہے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔اسی لیے مارشل لاؤں اور مارشل لاؤں جیسی جمہوریتوں میں بھی فیض صاحب کا اشتراکی معاشرے کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا۔فیض صاحب کا قاری ان کی شاعری سے کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری سطح پر یہی امید اور یہی رجائیت حاصل کرتا ہے۔وہ ظلم اور بربریت کی تصویر کشی تک محدود نہیں رہتے۔وہ ہمیں بتاتے ضرور ہیں کہ انسانیت کس نکبت اور ادبار کا شکار ہے لیکن اس کے ساتھ اس سے نکلنے کی جدوجہد پر آمادہ بھی کرتے ہیں، منزل کی راہ بھی دکھاتے ہیں اور منزل کے حصول کی خوش خبری بھی دیتے ہیں، جب فیض کہتے ہیں کہ:

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں

اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

تو ''تھوڑے'' کا لفظ انسانی تاریخ کے تسلسل میں ہے کہ جو ہزاروں سالوں سے جہد مسلسل میں مصروف ہے اور اب فاصلہ ہزاروں سالوں کا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے فیض صاحب کے ذہن میں ہزاروں کے مقابل سیکڑوں کے لیے تھوڑے کا لفظ آیا ہو یا اشتراکی نظریے کی مسلسل کام یابیوں کے نتیجے میں اس سے بھی کم لیکن عام قاری کے ذہن میں تھوڑا سا منے نظر آنے والی منزل کا مفہوم پیدا کرتا ہے جو اس کی ہمت بڑھاتا ہے۔ فیض صاحب کا شعری سفر جوں جوں آگے بڑھا، بین الاقوامی سیاست کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ناامیدی اور امید کی کش مکش بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے لیکن آخری فتح کا تصور ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا اور اسی نسبت سے ان کی شاعری کی رجائی فضا بڑھتی چلی گئی۔ فیض کی رجائیت میں ان کی قید و بند نے بھی بہت کردار ادا کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ زنداں کی صعوبتیں ان کا حوصلہ سلب کر لیتیں لیکن عام زندانی اور شاعر میں یہی فرق ہوتا ہے کہ شاعر کو جب پابند کیا جاتا ہے تو وہ مقتدرہ کی کم زوری بھانپ لیتا ہے جو شاعری کی طاقت کا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ شاعر سوچتا ہے کہ یہ مقتدرہ عظیم انسانی روح کی طاقت کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گی،

اس لیے قید کی مصیبتیں شاعر کے تخلیقی باطن کو مہمیز کرتی ہیں۔ اس حوالے سے سیّد سجاد ظہیر اپنے مضمون ''دست صبا کے بارے میں'' میں لکھتے ہیں:

> میرے خیال میں فیض کی دست صبا اور زندان نامہ۔۔۔۔ اس دعوے کی شہادت میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی، نامساعد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے بل کہ جہل اور رجعت کی کالی آندھیاں اسے اور بھی بڑھکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدے اور طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثیر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے لگتی ہیں۔ (۲)

فیض کو قید و بند نے یہ شعور عطا کیا کہ پابند سلاسل کرنے والے خوف زدہ ہیں اس لیے آزادی کے دن دور نہیں ہیں:

قفس ہے بس تمھارے ، تمھارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

انھیں یقین ہے کہ جب تک آزادیِ وطن کے لیے فرزندانِ وطن اور اعلیٰ انسانی معاشرے کے لیے انقلاب کی شمع ایقان دل میں روشن کیے جیالے مجاہد جہد آمادہ رہیں گے، جبینِ وطن روشن رہے گی اور آزادی کی منزل قریب تر آتی جائے گی:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

یا یہ کہ:

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

ہمارے عہد کا کوئی بھی شاعر فیض سے زیادہ اپنے عہد کے مسائل و معاملات، آرزوؤں اور تمناؤں کو نہیں سمجھتا۔ یہ درست ہے کہ ہمارے زمانے میں مزاحمتی شاعری کا چلن عام ہوا ہے۔ کسی زمانے میں صرف ترقی پسند شاعر ظلم اور استحصال کے خلاف لکھتے تھے، آج ہر شاعر کی شاعری میں استحصال دشمن عناصر مل جاتے ہیں لیکن اس فضا میں بھی فیض کی شاعری کی اپنی پہچان ہے اور الگ تاثیر ہے۔ فیض کا لب و لہجہ ہمارے باطن سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے پر جب کوئی ابتلا آتی ہے تو ہمیں فیض کی شاعری یاد آتی ہے۔ ہم جب کوئی چھوٹی بڑی تحریک چلاتے ہیں تو فیض کی شاعری ہمارے ہونٹوں پر رواں ہو جاتی ہے۔ ایک زمانے میں منبر سے فیض اور اس قبیل کے شاعروں کے خلاف آواز بلند ہوتی تھی اور انھیں کافر اور روسی ایجنٹ اور جانے کیا کیا کہا جاتا تھا، آج امریکی استعمار کے خلاف بولتے ہوئے مولانا حضرات بھی فیض کی شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ فیض کے قارئین کی تعداد ان کے انتقال کے بعد روز افزوں ہے اور ان کی شاعری کا دائرہ روز بہ روز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

حوالہ جات / حواشی

۱- ڈاکٹر آفتاب احمد، لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم''، مشمولہ ماہ نو لاہور، جلد ۶۱، شمارہ ۵، مئی جون ۲۰۰۸ء، ص: ۲۵۱

۲- ڈاکٹر تقی عابدی، فیض فہمی، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۰۷

☆ مضمون میں شامل فیض کی شاعری کے اقتباسات ''نسخہ ہائے وفا'' سے لیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں لاہور، س ن۔